حسنِ انتخاب

جب سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں

ابان ارشد

گزشتہ دنوں ایک حوالہ کی تلاش میں راقم کاروانِ احرار کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ چلتے چلتے ایک مردِ احرار کی آپ بیتی نظر سے گزری ـــــ حضرت سید ابومعاویہ ابوذر بخاری مدظلہ کے **بقول** ـــــ

"احرار ایسے جیالے مائیں روز روز نہیں جنا کرتیں۔ احرار کا طرہ امتیاز ہی یہ ہے کہ اللہ کے دین اور شریعت محمدی ﷺ کی خاطر!

پھانسیوں پر جھول گئے

گولیوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے

سنتِ یوسفی ادا کرتے کرتے جانیں وار گئے

بیویوں اور بچوں کو دین پر قربان کر گئے

خبیب، ابن عدی، عاصم قاری، طلحہ اور ابودجانہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی اتباع میں حرمتِ رسول و ختم نبوت کے تحفظ کا فرض ادا کرتے کرتے قربان ہو گئے"۔

اس قربانی، اس وارفتگی و جاں سپاری کو احرار کے پیکر جمیل مرزا غلام نبی جانباز مرحوم کی زبانی پڑھیے...... ذرا دیکھے تو سہی حق اور سچ کی راہ کتنی کٹھن، پر پیچ اور ہولناک ہے کہ جن راہوں پہ چلنا کسی صاحبِ عزیمت کے ہی حصہ میں آتا ہے۔ جانباز مرحوم لکھتے ہیں

"اگر مقصد کے حصول میں خلوص نہ ہو تو ایثار و قربانی کا تمام جذبہ ملمع ہو گا چاہے ظاہری چمک کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ ہو سکتا ہے، دیکھتی دنیا چمکتی چیز کو سونا سمجھ بیٹھے۔ لیکن تابکے؟

سیاست کی پر خار وادی میں مسلمان کارکن کو کیسے اور کیونکر سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ اگرچہ میرا موضوع نہیں، تاہم میری زندگی کا ایک وافر حصہ ضرور ہے۔

ع۔ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

سیاسی زندگی کے بائیس برس گذرنے پر اب شبہ کی حد سے یقین پر آن پہنچا ہوں کہ اس دنیا میں بھی غریب اور امیر کا سوال ویسے ہی موجود ہے، جیسے دنیا کے دوسرے جھمیلوں میں پایا جا رہا ہے۔ جہاں تک میری جدوجہد کا تعلق ہے۔ پنجاب بھر کی جیلوں کی دیواریں میری ہمت، اولوالعزمی اور ثابت قدمی کی آج بھی گواہ

۔ہیں۔ میرا قدم کسی ملکی اور مذہبی تحریک سے پیچھے نہیں رہا۔ اکثر مواقع ایسے آئے کہ جیل کے دروازے میں پہلا قدم میرا تھا۔

میرے بھی آباؤ اجداد میرے لئے دولت چھوڑ جاتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ لوگوں کے ہاں باعزت نہ ہوتا۔ اس دنیا میں عزت کا ذریعہ صرف دولت ہے، جس سے میرا دامن تہی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی جیل سے رہا ہو کر آیا تو احباب نے سوال کیا "کیوں بھئی جانباز اتنے دن کہاں رہے"؟ گویا انہیں میرے اسیر افرنگ ہونے کی خبر تک نہیں۔ خیر دنیا میں سینکڑوں نا انصافیاں ہیں جن کی گواہی تاریخ ماضی کے پاس بھی نہیں۔

تین برس جیل میں گزار کر جب گھر آیا، تو طاہرہ ماشاء اللہ چلنا سیکھ چکی تھی اور عزیزی زاہدہ بھی جسے ایک برس کی چھوڑ گیا تھا، اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ اب وہ دیوار کا سہارا لے کر محلے سے اپنے لئے کچھ خرید لاتی تھی۔ بیوی کے چہرے کی تمام رونقیں ضائع ہو چکی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ چہرے کی سرخی سیاہی میل ہو گئی تھی۔ سر کی مانگ میں سیندور کی جگہ اب کہیں کہیں سفید بالوں نے لے لی تھی۔ غرض تین برس کے غم و فکر نے اسے بیماری کی ایسی تصویر بنا دیا تھا۔ جس کا رنگ و روغن ضائع ہو چکا ہو۔ اثاثہ حیات جو پہلے ہی نہ ہونے کے برابر تھا، ضائع ہو چکا تھا۔

رہائی کے بعد صحت اور خانگی حالات کا تقاضہ تھا کہ میں کچھ دیر ستالوں لیکن ملکی حالات اسکی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ گھر کا ماحول اپنی طرف کھینچ رہا تھا اس کھینچا تانی میں تہی دامنی بھی سد راہ تھی۔ گھر میں کئی دنوں سے چولہا بجھا ہوا تھا۔

اسی ادھیڑ بن میں ایک شام امرتسر ریلوے اسٹیشن پر آنکلا۔ کافی دیر یونہی بغیر کسی مقصد کے اسٹیشن کی حدود میں گھومتا رہا۔ اب رات کا پہرہ شروع ہو چکا تھا۔ چراغوں کی روشنی بھی اندھیرے کو فریب نہ دے سکی اور یہ خیال میرے لئے ایک نئے عزم کا پیامبر ثابت ہوا۔

ان دنوں ہاوڑہ ایکسپریس (کلکتہ جانے والی گاڑی) اور کالکا ایکسپریس رات دس بجے کے بعد امرتسر سے گذرتی تھیں۔ میں رات کے اندھیرے میں چادر اوڑھے کھڑا تھا کہ ایک مسافر، جس نے اپنا سامان خود اٹھا رکھا تھا، میرے قریب سے گذرا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر اپنا سامان مجھے اٹھوا دیں تو مہربانی ہو گی۔ مسافر نے ایک نظر دیکھا اور سامان میرے سر پر رکھ دیا۔ گوروارام داس کی سرائے اسٹیشن سے قریباً دو میل کی مسافت پر تھی۔ وہاں پہنچ کر مجھے اس کی مزدوری چار آنے ملی۔ وہاں سے بھاگ کر پھر اسٹیشن پر آن پہنچا۔ اتنے میں شملہ جانے والی گاڑی کالکا ایکسپریس اسٹیشن پر آن پہنچی۔ میں نے پہلے کی طرح ایک مسافر کا سامان اٹھا لیا۔ مجھے اس نے پانچ آنے دیئے رات بارہ بجے گھر پہنچا تو میرے پاس نو آنے تھے۔ اس دور کی یہ رقم آج

کے مقابل پانچ روپے کے برابر تھی۔ صبح بچوں کے لئے دودھ اور دال روٹی کا آسرا ہو گیا۔ اس پر بیوی نے تعجب سے کہا۔ یہ پیسے آپ کہاں سے لائے؟ کہیں قرض تو نہیں اٹھایا"؟۔ "نہیں کسی دوست سے سابقہ قرض لینا تھا وہ لایا ہوں"۔ اس پر وہ مطمئن ہو گئی۔ اور ساتھ ہی وہ کہنے لگی۔ دیکھنا ادھار نہ لینا وقت ہے گذر ہی جائے گا۔ بیوی کا یہ مختصر جملہ میرے لئے ملامت کا باعث تھا۔

پندرہ برس کا سن تھا کہ اس دشت کی سیاحی کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ کاش کوئی ہنر ہاتھ میں ہوتا تو آج اتنی ندامت نہ ہوتی۔ لیکن جنون و شوق صحرا نوردی نے خرد کی تمام راہیں مسدود کر کے پتھروں اور کانٹوں میں لا پھینکا۔ آج پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔

دوسری رات پھر اسٹیشن پر چلا گیا۔ ابھی تردد میں تھا کہ کسی مسافر سے کہوں کہ ایک آواز آئی۔ سامان اٹھاؤ گے؟ "جی ہاں"۔ "چند لمحوں بعد ایک بوجھل بکس میرے سر پر تھا۔ اور میں چادر میں منہ چھپائے دور تک چلا گیا۔ یہ بوجھ میرے اپنے وزن سے زیادہ تھا۔ اس نے مجھے آٹھ آنے دیئے۔ اس طرح پندرہ دن یہ سلسلہ جاری رہا۔ میرا معمول بن گیا تھا کہ رات چوری چھپے یہ مزدوری کرتا اور دن بھر کے لئے روزی کما لیتا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ محلہ شریف پورہ کے ایک صاحب کا سامان اٹھا کر جب اس کے گھر پہنچا تو مزدوری کے لئے کچھ تلخی سی ہو گئی۔ اس دوران صاحب خانہ کے سسر پر جو میری نظر پڑی تو میں فوراً منہ چھپا کر باہر چلا آیا۔ یہ تھے میاں محمد سوداگر چرم۔ آپ مجلس احرار پنجاب کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ وہ میری آواز پہچان گئے تھے۔ انہوں نے مجھے گلی کی نکڑ پر آن لیا۔ دیکھتے ہی بے اختیار رونے لگے۔ گھر لے آئے۔ دودھ پلایا اور اپنی گاڑی پر مجھے میرے گھر چھوڑ گئے۔ اور خود اسی وقت لاہور چلے گئے۔ دوسری صبح نور کے تڑکے میں باہر سے آواز پڑی۔ دیکھتا ہوں کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، صدر آل انڈیا مجلس احرار، میاں محمد عمر کے ساتھ کھڑے ہیں۔ جلدی سے دروازہ کھولا۔ مولانا نے مجھے فوراً اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ بھری آواز سے کہا۔

"جانباز! تو نے اپنی نہیں میری توہین کی ہے۔ جب میں بیٹھا ہوں تو تجھے یہ حرکت نہیں کرنی چاہیئے تھی۔"

یہ کہتے ہوئے مولانا نے مجھے پچاس روپے دیئے۔ اس رقم سے کچھ سابقہ قرض اتر گیا اور کچھ راشن خرید لیا گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ زعماء احرار نے کارکنوں کی ایسی ہی تربیت کی۔ وہ والنٹیرز کو صف اول میں دیکھنا پسند کرتے، ان کے معاشی حالات سے آگاہ رہنا، اخلاق اور کردار کی اصلاح کرنا بھی ان کے ذمہ تھا۔ کسی جماعت کی بقا اور لیڈر کا اپنا مستقبل بھی انہیں ستونوں پر قائم ہے۔ اگر یہ دیوار پختہ نہ ہو تو نہ پارٹی کا وجود قائم رہ سکتا ہے اور نہ رہنما کو دوام حاصل ہوتا ہے۔ (کاروان احرار۔ جلد سوم۔ ص ۲۱-۱۷)